نگارشات متعلق شمسؔ

ماخوذ از کتاب سید محمد باقر شمسؔ فن اور شخصیت مرتبہ جناب حسین انجمؔ صاحب

(۱)عظمتِ زبان وبیان کا علمبردار

جناب پروفیسر سردار نقوی

مولانا حالی نے اپنے ایک شعر میں خود اپنا تعارف اس طرح کرایا ہے:

بہت جی خوش ہوا حالیؔ سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

کم وبیش یہی مضمون حضرتِ جوشؔ ملیح آبادی نے اس طرح نظم کیا ہے:

بہت جی خوش ہوا، اے ہمنشیں ! کل جوشؔ سے مل کر
ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں

جناب مولانا باقر شمسؔ کا شمار بھی اس محترم صف میں ہوتا ہے، جس پر جوشؔ صاحب کا یہ شعر اپنی پوری معنویت کے ساتھ صادق آتا ہے۔ان کی شرافت کا سرچشمہ وہ تہذیب وثقافت ہے، جس کے متعلق انھوں نے اپنی کتاب ''لکھنؤ کی تہذیب ''میں نہایت محققانہ گفتگو فرمائی ہے۔اس کتاب دیباچہ میں انھوں نے لکھنؤ کی تہذیب کی جن خصوصیات کا ذکر کیا ہے، ان میں نفاستِ طبع ، نزاکتِ مزاج ، پاکیزگیِ ذوق ،شاعرانہ صلاحیت ،ذہنی جودت ،حاضر جوابی ،جرأتمندی اور بانکپن جیسی خوبیاں شامل ہیں۔ یہ تمام خوبیاں جناب باقر شمسؔ کی شخصیت کا حصہ ہیں ۔ان کا تعلق لکھنؤ کے اس خاندانِ اجتہاد سے ہے، جو اپنی مذہبی اور علمی فضیلت کے اعتبار سے نہایت معروف اور محترم حیثیت رکھتا ہے۔لکھنؤ کی تہذیب کے فروغ اور استحکام میں اس خاندان کے مذہبی، علمی اور ادبی کارناموں نے بڑا وقیع کردار ادا کیا ہے۔

مولانا محمد باقر شمسؔ خاندان اجتہاد کی اس علمی روایت کے امین ہیں۔اس اعتبار سے ان کی شخصیت نہ صرف یہ کہ لکھنؤ کی تہذیب کی مظہر ہے، بلکہ اس تہذیب کا ایک ایسا حصہ ہے، جس نے اپنے کل کے فروغ کے لئے قابلِ قدر کارنامے انجام دیئے ہیں۔

ہمارا موجودہ معاشرہ تہذیبی قدروں کے اضمحلال اور انتشار کی وجہ سے بے جہتی کا شکار ہے۔ایک ایسے معاشرہ میں جہاں زندگی کی واحد قدر کسبِ زر اور طلبِ منفعت قرار پائے ، انسانوں کے درمیان باہمی رشتے محبت اور اخوت کے بجائے افادیت کی ترازو میں تولے جاتے ہیں۔افادیت کا حد سے بڑھا ہوا رجحان انسانوں کو انسانیت کی سطح سے گرا کر پھاڑ کھانے والا درندہ بنا دیتا ہے، جس کا لازمی نتیجہ ظلم واستحصال،لوٹ کھسوٹ اور قتل وغارت گری کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔دراصل دولت کی محبت ایک ایسا عقیدہ ہے، جس کی قربانگاہ پر انسان سب سے پہلے جس چیز کو قربان کرتا ہے، وہ اس کی اپنی انسانیت ہے، یہی وجہ ہے کہ ہمارے دور کے انسان انسانوں کے بھیس میں غرانے والے بھیڑیے اور پھاڑ کھانے والے درندے ہیں، جن کی ہوسِ زر نے پورے کرۂ ارض کو انسانوں کی قتل گاہ بنا دیا ہے۔

ایسے انسانیت کش اور اقدار دشمن دور میں ایسی شخصیتیں جنھیں اگلی شرافت کا نمونہ کہا جا سکے،تعداد کے اعتبار سے کم (بلکہ بہت ہی کم) ہیں۔مولانا محمد باقر شمسؔ کا شمار بھی انھیں معدودے چند ہستیوں میں ہوتا ہے۔وہ بربریت کے مقابلہ میں ان تہذیبی اقدار کے علمبردار ہیں، جو انسانوں کو حیوانیت کی سطح سے بلند ہوکر انسانیت کے اعلیٰ مدارج تک ترقی کی دعوت دیتی ہیں۔

انسانیت کی تمام علمی اور تہذیبی ترقی کا سرچشمہ وہ صلاحیت

واستعداد ہے، جسے حکمائے قدیم نفس ناطقہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان حکماء کے نزدیک انسان کی تعریف ہی یہ ہے کہ وہ حیوان ناطق ہے، یعنی انسانوں اور حیوانوں کے درمیان وہ امتیازی صفت ہے، جسے صلاحیتِ نطق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ صلاحیتِ نطق کا اظہار زبان کے ذریعہ ہوتا ہے۔ زبان کی تخلیق صلاحیتوں کے اظہار کا سب سے پہلا اور سب سے اہم مظہر ہے اور یہی وہ امتیازی صلاحیت ہے، جو ایک طرف انسانوں کو دوسرے حیوانوں سے ممتاز کرتی ہے اور دوسری طرف انسانیت کی علمی اور تہذیبی ترقی کے لئے اسباب و وسائل مہیا کرتی ہے۔ مولانا باقر محمد شمس نے اپنے مقالہ میں جس عنوان ''تخلیق زبان کا فلسفہ'' ہے اس موضوع پر نہایت اہم اور گرانقدر خیالات پیش فرمائے ہیں۔ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی نے اپنے ایک خط میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے نام تحریر کیے گئے اس مضمون پر اس طرح تبصرہ کیا ہے:

''اس مضمون کو میں نے بڑے غور سے اور بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھا۔ میں سمجھا تھا کہ اس میں کچھ باتیں وہ ہوں گی، جو لسانیات کے سلسلہ میں عام طور سے کہی جاتی ہیں، مگر میں نے یہ دیکھا کہ اس میں شروع سے آخر تک سب نئی باتیں ہیں۔ لسانیات کے مسئلہ پر یہاں بالکل نئی اور اچھوتی نظر ملتی ہے، جو بہت ہی زیادہ قابلِ قدر ہے۔''

سیاسی اور ثقافتی میدانوں میں مغرب سے مغلوب اور مرعوب ہونے کے نتیجہ میں ہماری فکر ونظر میں جو خرابیاں پیدا ہوئیں، ان میں ایک بڑی خرابی زبان و بیان کی عظمت اور اہمیت سے اغراض وانکار ہے، حالانکہ ہر اہلِ نظر اس بات کو بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ انسانیت کی تمام علمی اور تہذیبی ترقی کا سرچشمہ زبان و بیان کی خوبی ہے۔ یہ زبان ہی ہے، جو اظہار و ابلاغ کا واحد وسیلہ ہے۔ ہم دوسروں تک اپنا مافی الضمیر زبان کے وسیلہ سے فرد تک، ایک گروہ سے دوسرے گروہ تک اور ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتا ہے۔ اس وسیلہ و ابلاغ کے بغیر علم کی ترقی اور فروغ کسی طرح ممکن ہو ہی نہیں سکتا۔ انسان کی اسی صلاحیت کا سورۂ رحمان میں خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ الرحمن، علم القرآن، خلق الانسان، علم البیان، یہی بیان کی خوبی ہے، جسے دوام و استقلال قلم کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ قلم علم کو ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل کرنے اور علمی ورثہ کو محفوظ رکھنے کا وسیلہ ہے۔ اس زوال آمادہ اور فنا پذیر دنیا میں قلم علم کے بقا اور تحفظ کی علامت ہے۔ جوش ملیح آبادی نے اپنے ایک مرثیہ کے چہرہ میں قلم کی عظمت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ اس مرثیہ کے ایک بند میں وہ فرماتے ہیں۔

اے قلم ! صورتِ میزان و معارف مقیاس
علم بنیاد و ہنر محور و ادراک اساس
فکر پیما و نظر ناقد و فرہنگ شناس
مشعل قصر ادب ، مشرقِ صبح قرطاس
نام تیرا سببِ جنبشِ لب ہائے رسولؐ
اے قلم ! آخری لمحہ کی تمنائے رسولؐ

قلم کی عظمت سے انکار دراصل انسان کی عظمت سے انکار ہے۔ دوسرے لفظوں میں قلم کا احترام انسانیت کا احترام ہے اور زبان کی صحت وحسن کا لحاظ قلم کے احترام کی لازمی شرط ہے۔

ہمارے خیالات وافکار کے اظہار و ابلاغ کا وسیلہ الفاظ ہیں۔ الفاظ و خیالات میں بڑا گہرا اور بامعنی رشتہ ہوتا ہے۔ یونان کے عظیم فلسفی سقراط نے اپنے آخری لمحات میں اپنے شاگرد کریٹو (Crito) سے جو مکالمہ کیا ہے، اس میں ایک موقع پر لفظوں کے استعمال پر گفتگو کرتے ہوئے اس نے کہا کہ لفظوں کا غلط استعمال اپنی جگہ خرابی ہونے کے ساتھ ہی انسانی نفس میں خرابی پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے۔ سقراط کے اس قول پر جس قدر غور کیا جائے، لفظ کی عظمت وحرمت کا احساس اسی قدر زیادہ شدید ہوتا جاتا ہے۔ لفظوں کا غلط استعمال نفس میں خرابی پیدا کرتا ہے، گویا اخلاقی صحت کا تعلق الفاظ کی صحت سے ہے۔

مولانا محمد باقر شمس اس قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں، جو الفاظ کی صحت اور حرمت کا علمبردار ہے اور یہ بجائے خود ان کے نفس کی صحت اور ان کی شخصیت کے استحکام کی دلیل ہے اور اس معاملہ میں شدت تہذیبی اور اخلاقی اقدار پر ان کے یقین و اعتماد کی دلیل ہے۔ وہ ایک ایسے ماحول میں جہاں صحت زبان و حسنِ بیان کو غیر اہم (بلکہ غیر ضروری) سمجھا جاتا ہے، پوری قوت اور شدت کے ساتھ حسنِ زبان و بیان کی اہمیت اور ضرورت کا علم بلند کئے ہوئے ہیں۔ ان کی تحریریں زبان کی نفاست و لطافت کا ایسا مرقع ہیں، جس کی داد وہی لوگ دے سکتے ہیں، جن کا ادبی ذوق پاکیزہ اور تربیت یافتہ ہو اور یہ مولانا کی شخصیت کا ایک رخ ہے، جس پر اختصار سے گفتگو کی گئی ہے۔ ان کی شخصیت کے کئی اور تابناک پہلو ہیں۔ ادب، مذہب، فلسفہ، تاریخ اور تہذیب کے مختلف موضوعات پر ان کی تحریریں ان کی محققانہ بصیرت کی آئینہ دار ہیں، جن کا مطالعہ عالمانہ سنجیدگی کی سطح سے کیا جانا چاہیئے

مولانا محمد باقر شمس اپنی ذات میں شرافت کا ادارہ اور ثقافت کا ایسا روشن مینارہ ہے، جو ماضی کی انسانیت افروز اور تہذیب آموز اقدار کے اجالے بکھیر رہا ہے، اس بات کی پرواہ کئے بغیر کہ ان کے اجالوں کے قدردان اب کم (بلکہ بہت کم) رہ گئے ہیں۔ ''ادارۂ طلوع افکار'' نے مولانا کی شخصیت کو خراجِ تحسین پیش کرنے کا فیصلہ کرکے دراصل ایک فرضِ کفائی ادا کیا ہے۔



(۲) نابغۂ روزگار

جناب وحیدالحسن ہاشمی، مدیر پیام عمل، لاہور

غالبؔ اپنے دور کا جدت پسند، ذکی الحس، بلند خیال اور جینیس (genius) شاعر تھا۔ اس کا دل پارہ صفت اور اس کی نظر جستجو خیز تھی۔ پہلے اس کی خصوصیت طبع کے متعلق دو واقعے سن لیجئے:

(۱) مرزا عبدالقادر غمگینؔ بہادر شاہ ظفر کے درباری شاعر اور قاضی القضات تھے۔ ان کی کتاب ''وقائع عبدالقادر خانی'' بہت مشہور ہے۔ ایک دن از راہِ ظرافت کسی موقع پر غالبؔ سے کہا:

''آپ کا ایک شعر میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اسی وقت دو مصرعے خود موزوں کرکے غالبؔ کے سامنے پڑھے۔

پہلے تو روغنِ گل بھینس کے انڈے سے نکال
پھر دوا جتنی ہے کل بھینس کے انڈے سے نکال

مرزا غالبؔ یہ سن کر سخت حیران ہوئے اور کہا:

''حاشا یہ میرا شعر نہیں۔'' بڑی بحث و تمحیص کے بعد مرزا کو معلوم ہوا کہ عبدالقادر گویا جتاتے ہیں کہ ان کے دیوان میں اسی قسم کے اشعار ہوتے ہیں۔''

غالبؔ کو اس بات پر تو غصہ تھا ہی کہ یہ ان کا شعر نہیں، لیکن باعثِ کبیدہ خاطری یہ امر تھا کہ ایسا مہمل شعر ان سے منسوب کردیا گیا۔

(۲) غالبؔ کے ایک شاگرد دہلی سے لکھنؤ گئے۔ ایک مجلس مرثیہ خوانی میں انیسؔ کی زبان سے ان کا مرثیہ سنا۔ بہت متاثر ہوئے۔ دہلی واپس آکر استاد کو دو چار بند سنائے اور جورگِ دہلویت پھڑکی تو اصرار کر بیٹھے۔

استاد! آپ بھی ایسا مرثیہ کہیں۔ کتابوں میں تحریر ہے کہ غالبؔ نے صرف تین بند کہے اور کہا:

مرثیہ کہنا انیسؔ کا ہی حصہ ہے۔

اس واقعہ سے بھی یہ اشارہ ملتا ہے کہ جب شعر گوئی سے خود شاعر ہی مطمئن نہ ہو تو شعر کہنے کا کوئی فائدہ نہیں۔

مولانا باقر شمسؔ اس دور میں ایک بہت بڑے سخن شناس، سخن سنج، سخنداں اور سخن پرور انسان ہیں۔ ان کی طبیعت کا یہ عجیب خاصہ ہے کہ جب بھی ان کے سامنے کوئی مہمل لفظ، شعر یا عبارت آتی ہے تو ان کے وجدان کو زبردست ٹھیس لگتی ہے۔ اس کا اظہار ان کے ماتھے کی شکنوں یا مجبوراً ان کی تحریروں سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ ان کی مکمل تصنیف ''شعور و شاعری'' اسی جذبہ

کی عکاسی کرتی ہے۔

انہوں نے اس کتاب میں دس گیارہ اردو کے اہم شاعروں کے کلام میں ناقابلِ تردید خامیاں بیان کی ہیں تا کہ آنے والے شعرا ان خامیوں سے گریز کریں اور اردو کو لولا لنگڑا کرنے کی جو کوششیں ہورہی ہیں، ان کا سدِ باب ہوجائے۔ ذرا اندازہ کیجئے کہ سو برس کے بعد غالبؔ کی اس ادا کی جھلک کہاں نظر آرہی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ جب مولانا کی نظر اتنی دقیق اور ژرف بین ہے تو وہ خود شعر کہہ کر ایک عظیم شاعر کیوں نہ بن گئے۔ اس کا جواب خود مولانا کی زبان سے سنیے:

''بڑے بڑے اساتذہ کی خدمت میں برسوں حضوری کا شرف حاصل رہا، ان کی قدرتِ بیان، تازگیٔ مضمون ، محاسنِ شعر یہ اور مصرع لگانے میں فنکاری اور کمال کو سمجھا۔۔۔اس کے بعد اپنے کلام کا جائزہ لیا تو محسوس ہوا کہ میرے اشعار کی بندش چست ودرست ہے ، ادائے مطلب پر قادر ہوں، عروض وقافیہ، معانی بیان اور زبان ومحاورہ کی کوئی غلطی نہیں، مگر پامال مضامین کو فرسودہ طریقہ پر نظم کرتا ہوں۔۔۔کوئی تازگی نہیں، کوئی انفرادیت نہیں۔ اپنے کو شاعر سمجھنا خود کو دھوکا دینا ہے اور شعر کہنا وقت ضائع کرنا ہے۔ میں نے فوراً شعر کہنا چھوڑ دیا۔'' (شعور وشاعری)

''دیکھئے! غالبؔ نے مرثیہ نہ کہنے کی یہی وجوہ خیال کی ہوں گی، فرق صرف یہ ہے کہ غالبؔ نے اس کا کہیں اظہار نہیں کیا، مولانا نے باقاعدہ تحریر لکھ دی۔''

مولانا کا تعلق خاندانِ اجتہاد سے ہے۔ معقولات و منقولات کے علاوہ اس خاندان کی زیرکی اور ذی حسی ضرب المثل ہے، یہی سبب ہے کہ تاریخ ہو یا تمدن، نظم ہو یا نثر، مذہب ہو یا سیاست، چھوٹے سے چھوٹا واقعہ بھی مولانا کی طبیعت پر اثر انداز ہوجاتا ہے اور جب تک وہ اس واقعہ کی اصلیت اور حقیقت معلوم نہیں کر لیتے ان کا دل مطمئن نہیں ہوتا۔

کوئی بھی تحریک ہو، اس کے کارکن اور اس کے وارث میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ تحریک کا کارکن بددل ہوکر ماند پڑ جاتا ہے، لیکن اس کا وارث تحریک پر گز ند نہیں آنے دیتا، خواہ اسے اپنی جان کا نذرانہ ہی پیش کرنا کیوں نہ پڑے۔ ہندوستان کے دوسرے خاندانوں نے علم وعمل کے چراغ روشن کئے، لیکن خاندانِ اجتہاد نے کشت خاکِ تار سے شمس وقمر لگائے، کیونکہ وہ اپنے کو تحریک کا کارکن نہیں بلکہ وارث سمجھتا تھا۔ تحریکِ زبان اردو میں اس خاندان کی کوششیں آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں

مولانا باقر شمسؔ اسی خاندان کے چشم وچراغ ہیں۔ عربی وفارسی اور اردو سے انھیں فقط ربط نہیں بلکہ عشق ہے۔ شاعری ترک کرنے کا مقصد اردو زبان سے لاتعلقی اور بے توجہی نہیں۔ وہ اپنے کو اہلِ زبان نہیں آلِ زبان سمجھتے ہیں، یہی سبب ہے کہ انھوں نے اردو کی ترویج کے لئے اپنے دل ودماغ کے تمام دریچے کھول دیئے ہیں۔

اردو کی اصل اور اس کے ارتقا کے متعلق متعدد نقادوں نے اپنا اپنا نظریہ پیش کیا ہے۔ مولانا آزاد نے ''آبِ حیات'' میں کہا ہے کہ اردو برج بھاشا سے نکلی۔ سید سلیمان ندوی نے تحریر کیا ہے کہ مسلمان اول اول سندھ میں آئے، اس لئے سندھی مسلمانوں کے ملاپ سے جو زبان پروان چڑھی، اس کا نام اردو ہے۔ حافظ محمود شیرانی نے یہ دلیل پیش کی کہ جب مسلمان خیبر کی راہ سے واردِ پنجاب ہوئے تو یہاں کی زبان کے زیرِ اثر ایک نئی زبان معرضِ وجود میں آئی، جس کے اسم فعل اور حرف پنجابی زبان سے موانست رکھتے ہیں، اس لئے اردو پنجابی سے بنی ہے۔ ڈاکٹر محمود حسین (علی گڈھ یونیورسٹی) نے اپنے مقالہ میں یہ ثابت کیا ہے کہ اردو دراصل بجنور اور اس کے نواحی علاقوں میں پیدا ہوئی ۔۔۔لیکن مولانا نے اپنی کتاب ''تاریخ زبان اردو'' میں متعدد حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ موجودہ اردو قدیم سورسینی زبان ہی کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ مولانا ہی کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں۔

''میں بہت غور وخوض کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ سورسینی پراکرت ہے، جو ہندوستان کے بڑے بڑے علاقوں میں بولی جاتی تھی اور ہر علاقہ کی نسبت سے اس کا الگ الگ نام تھا۔ دہلی کی زبان بانگڑو، متھرا کی برج بھاشا، بندیل کھنڈ کی بندیلی، اودھ کی اودھی اور بہار کی مگدھی کہی جاتی تھی ۔ ان مقامات کی بولیوں میں کچھ مقامی محاورے داخل ہو گئے اور کچھ کا لہجہ کے تغیر سے الفاظ کا تلفظ بدل گیا۔ اصلی زبان ایک ہی تھی، جس کے بنیادی الفاظ ان تمام زبانوں میں آج بھی موجود ہیں ۔ اپ بھرنش بھی سورسینی پراکرت ہی کی کچھ متغیر شکل تھی، جس میں سورسینی پراکرت کے تمام بنیادی الفاظ موجود ہیں۔'' (تاریخ زبان اردو)

''مولانا نے فیلالوجی کے مسائل پر جتنے مضامین سپردِ قلم کئے ہیں، انھیں دیکھتے ہوئے مولانا کو ایک ماہرِ لسانیات کہنا پڑتا ہے۔

یہ پہلے ہی کہا جا چکا ہے کہ مولانا کا دل اردو زبان کے دل کے ساتھ دھڑکتا ہے۔ مولانا کی عمر کا بڑا حصہ ضلع جونپور میں گزرا، لیکن جب انھیں محسوس ہوا کہ لکھنؤ کی اردو زبان پر مسلسل مخالفت کے تیروں کی بارش ہو رہی ہے تو انھوں نے لکھنوی تہذیب اور لکھنؤ کی شاعری پر قلم اٹھایا اور کم علم ناقدوں کو بتایا کہ لکھنوی شاعری محض خارجی نہیں ، بلکہ اس میں داخلیت کے عناصر بدرجۂ اتم پائے جاتے ہیں ان کے قول کے مطابق ذوق اور داغ دہلوی شعرا ہیں۔ لیکن ان کا مزاج خارجی ہے ۔ ان کے مقابلہ میں آتش اور امیر مینائی داخلیت پسند ہیں''۔

اس کے علاوہ لکھنوی شعرا نے لفظوں کی تراش خراش اور شعر گوئی کا جو اسلوب اردو کو عطا کیا، وہ ارتقائے زبان پر ایک احسان عظیم ہے، جو لوگ لکھنویت اور دہلویت کو جدا جدا کر کے ایک کو مرغوب اور دوسری کو مذموم قرار دیتے ہیں، ان کے متعلق مولانا کے دلائل کس قدر وزنی ہیں۔

''غزل میں بازاریت کی ابتدا جرأتؔ'' اور رنگینؔ سے ہوئی اور داغؔ تک وہ رنگ باقی رہا۔ اسے لکھنؤ کے سر تھوپنا درست نہیں''۔

جرأتؔ اور میرؔ میں تو کوئی فرق ہی نہیں ۔ دونوں ایک ہی زمانہ میں لکھنؤ آئے اور ایک ہی سال دونوں کا انتقال ہوا۔ اگر جرأتؔ کی شاعری لکھنوی ہے تو میرؔ کی شاعری دہلوی کیوں؟

اور ستم ظریفی دیکھیے! میرؔ تیس برس، سوداؔ بارہ برس، مصحفیؔ بیالیس برس لکھنؤ میں رہے اور لکھنوی نہیں کہے جاتے اور رنگین نو برس لکھنؤ میں رہنے سے لکھنوی ہو گئے''۔

اس سے زیادہ مزہ کی بات یہ ہے کہ جب دہلویت کا ذکر آتا ہے تو میر، سوداؔ، دردؔ اور غالبؔ کا کلام پیش کیا جاتا ہے ۔ یہ نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ یہ ان لوگوں کا خاص اسلوب اور ان کی انفرادیت ہے ۔ اگر یہ دہلویت ہے تو ہر شاعر کا کلام ایسا ہی ہونا چاہیئے ۔ کیا وجہ ہے کہ میرؔ، سوداؔ، دردؔ، شاہ نصیرؔ، ذوقؔ، غالبؔ اور مومنؔ، سب کا رنگ الگ الگ ہے'' دہلویت وہی ہے ، جو سب میں مشترک ہو۔''

مولانا نے صاف الفاظ میں تحریر کیا ہے:

''انشاؔ، جرأتؔ اور رنگینؔ کی بیہودگیاں لکھنوی تہذیب کے بالکل خلاف تھیں ۔ اس کا بہترین ثبوت یہ ہے کہ ان کا رنگ کسی نے اختیار نہیں کیا بلکہ اسے مردود قرار دیا۔ (لکھنؤ کی شاعری)

بعض حضرات کا خیال ہے کہ مولانا منفی نقدِ تحریر کے تو ماہر ہیں ،لیکن مثبت اندازِ تحریر ان کے مزاج کے خلاف ہے ۔ یہ رائے مولانا کی تحریروں کو پڑھے بغیر قائم کی گئی ہے۔ مولانا نے

اگر شعراء کے کلام میں نقائص تلاش کئے ہیں تو متعدد شعراء اور نثر نگاروں کے اسلوب کی تعریف بھی کی ہے۔ مثلاً:

''امیدؔ صاحب غزل تو کہتے تھے، مگر اپنے خاندانی اثرات اور کچھ استاد کے اثر سے غزل میں معشوق مجازی اور اس کے حسنِ ظاہری اور سامان آرائش کا ذکر نہیں کرتے تھے۔ (سید محمد جعفر امید۔۔۔ نگارشاتِ رنگ رنگ)

''اردو میں صرف دو شاعر ایسے ہیں، جن کی طبیعت کہیں نہیں رکتی، ذہن کسی منزل پر نہیں جھکتا، نئ تشبیہیں، اچھوتے استعارے اور ایک ایک بات کی سیکڑوں تعبیریں ان کے سامنے صف بستہ کھڑی رہتی ہیں۔ الفاظ پر انھیں وہ قدرت ہے کہ ان کی ترکیب سے وہ شعر نہیں کہتے، سحر کرتے ہیں۔۔۔ وہ انیس اور ان کے بعد جوشؔ ہیں۔ (جوشؔ ملیح آبادی۔۔۔ نگارشاتِ رنگ رنگ)

''شیخ ممتاز حسین (ایڈیٹر ''اودھ پنچ'') کو جن لوگوں نے دیکھا تھا، وہ ان کے مقابلہ میں بڑے بڑے مدعیان علم کی حقیقت نہیں سمجھتے تھے۔ وہ منطق، فلسفہ، ریاضی، تاریخ، طب اور فن اخلاق میں ایسا درجہ رکھتے تھے، جو ان علوم کے جاننے والے کے شایانِ شان سمجھا جاسکے۔ (نگارشاتِ رنگ رنگ)

مولانا کی طرزِ تحریر کی درج ذیل چار خصوصیات ہیں:

(۱) تحقیق

(۲) استدلال

(۳) طنز

(۴) سادگی

مندرجہ بالا عناصرِ اربعہ کی تفصیلی بحث میں دوسرے احباب کی اصابتِ رائے پر چھوڑتے ہوئے صرف چند مثالیں دے کر یہ دعا کرتا ہوں کہ خداوندِ کریم اس نابغۂ روزگار اور یگانۂ زمانہ کی زندگیِ قلیل کو حیاتِ طولانی میں تبدیل کردے تاکہ تشنگانِ علم وادب اس بحرِ بیکراں سے اپنی پیاس بجھاسکیں!

(۱) تحقیق کی مثال: دنیا کی کسی زبان میں مستند زبان کو ٹکسالی نہیں کہا جاتا۔ ٹکسال میں تو سکے ڈھلتے ہیں۔ زبان سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ صرف اردو میں ناسخؔ کی زبان کے لئے کہا جاتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ محلہ ٹکسالی میں رہتے تھے۔ ان کی زبان میں جو شعر کہتا تھا، اس کی تعریف میں کہا جاتا تھا کہ یہ ٹکسالی زبان ہے، یعنی ناسخؔ کی زبان ہے۔ باہر والوں نے اس کا مطلب نہیں سمجھا۔ وہ اسے مستند زبان کے معنوں میں بولنے لگے۔ (لکھنؤ کی شاعری)

(۲) استدلال کی مثال: اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ اس عالمِ وجود کے پیچھے کوئی اسکیم اور کوئی کارفرما قوت موجود نہیں تو لا محالہ یہ اقرار کرنا پڑے گا کہ یہ عالم رنگ و بو محض ایک اتفاق کے نتیجہ میں ظہور پذیر ہوگیا۔ (نگارشاتِ رنگ رنگ)

(۳) طنز کی مثال: غالب نے ''طپیدن'' کو غلط کہا ہے۔ اس کو صحیح کس نے کہا ہے؟ ہم نے تو کسی کتاب میں تپ، تپاں اور تپش ''ط'' سے لکھا نہیں دیکھا۔ غالبؔ نہ معلوم کس ترنگ میں تھے۔ شاید ان کے زمانہ میں کسی جاہل نے 'تپیدن' کو 'ط' سے لکھ دیا ہوگا۔ (نگارشاتِ رنگ رنگ)

(۴) سادگی کی مثال: اس کتاب میں شعر کی فنی غلطیاں بتاکے ان کی اصلاح کی گئی ہے۔ اس میں ادنیٰ اور اعلیٰ ہر درجہ کے شاعر کا کلام ہے۔ ایسے بھی ہیں جو شعر کہتے کہتے بوڑھے ہوگئے، مگر کہنا نہ آیا۔ اس سے کسی کی تخفیف منظور نہیں۔ نہ کسی کے شعر کی اصلاح سے اس کے مرتبہ میں فرق آسکتا ہے۔ جو جس درجہ کا ہے اسی درجہ کا رہے گا۔ اس کی غرض یہ بتانا ہے کہ فنی نقص سے شعر کا حسن خاک میں مل جاتا ہے اور اس کو دور کردینے سے وہ چمک اٹھتا ہے۔ اس سے فن کی اہمیت ظاہر اور ذوق سلیم کی رہنمائی ہوتی ہے۔ (شعور وشاعری)



(۳) شخصیتِ گراں مایہ

جناب پروفیسر ڈاکٹر نعیم تقوی

یہ زمانۂ قحط الرجال ہے، اس لئے عصرِ حاضر میں اگر کوئی صاحبِ کمال ہے تو اس کا وجود نعمتِ ذوالجلال ہے۔

مولانا محمد باقر شمسؔ صاحب خاندانِ اجتہاد کی روشن یادگار ہیں۔ان کی ذات اسلاف کی تہذیب کی آئینہ دار ہے، جس سے تبحرِ علمی آشکار ہے۔وضعداری اور انکساری ان کا شعار ہے۔وہ یادگار اساتذۂ کہن ہیں اور اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں۔تحقیق کے حوالہ سے بڑے بڑے صاحبانِ علم نے ان کا لوہا مانا ہے اور تنقید نگار کی حیثیت سے معتبر جانا ہے۔تنقید میں ان کا مشرقی انداز ہے، جو ان کے کلاسیکی مذاق کا غماز ہے۔اگر چہ عصرِ حاضر میں تنقیدی رجحانات میں بھی انقلاب آیا ہے، لیکن تنقیدی شعور کے تاثراتی اور جمالیاتی دبستان میں مولانا موصوف کی شخصیت گرانمایہ ہے۔صحت لفظی اور الفاظ کے دروبست پر چونکہ ان کی گہری نظر ہے، لہٰذا ان کی تنقید جاذبِ اثر ہے۔جمالیاتی لطافت اور تحسین شاعری کے متعلق ان کے مضامین میں حسن کاری کا ایسا معیار ہے کہ زبان و بیان کا لطف آشکار ہے۔مغربی حاسۂ انتقاد اور جدید تنقید نگاری کا ان کے ہاں فقدان ضرور ہے، لیکن امداد اثر ،حامد حسن قادری ،جعفر علی خاں اثر لکھنوی ، پروفیسر محمود شیرازی اور عندلیب شادانی کی طرح انھوں نے اپنی سطح پر جو خدمات انجام دی ہیں ان کا اعتراف ضروری ہے۔

لکھنؤ کی تاریخ ،لکھنؤ کی تہذیب ،لکھنؤ کی شاعری ،لکھنؤ کی زبان اور شعور و شاعری ایسی معرکۃ الآرا کتابیں ہیں ،جن کے سبب مولانا کو ہر عہد میں یاد کیا جاتا رہے گا۔مذکورہ کتابیں اس قدر جامع اور وقیع ہیں کہ ریسرچ اسکالرز کو ان کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیئے تا کہ انھیں ایسی معلومات یکجا فراہم ہوسکیں ، جو بلا مبالغہ درجنوں کتابوں سے استفادہ کے بعد بھی ممکن نہیں۔

''تاریخ لکھنؤ'' اپنی جامعیت کے اعتبار سے اس دور کی سب سے زیادہ معتبر و مستند اور معلومات افزا کتاب ہے۔مولانا عبدالحلیم شرر کی شہرۂ آفاق کتاب ''مشرقی تمدن کا آخری نمونہ'' کے بعد یہ تخلیق بے مثال ہے۔

''لکھنؤ کی تہذیب'' ایک ایسا مرقع دلنشیں ہے، جس میں جا بجا تاریخی حوالہ جات سے موضوع کو مستحکم انداز سے پیش کیا ہے۔علومِ عقلیہ ونقلیہ اور جملہ فنونِ لطیفہ کے علاوہ بھی مختلف موضوعات پر اس کتاب میں جو مواد پیش کیا گیا ہے ،اس سے مصنف کی جگر کاوی ظاہر ہے۔لکھنؤ کی تہذیب کا ہر گوشہ بے نقاب کیا گیا ہے۔

''لکھنؤ کی شاعری'' میں شعرائے لکھنؤ کے فنی ارتفاع پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے اور لکھنؤ اور دہلی کی شاعری کا حقیقت پسندانہ موازنہ بھی کیا گیا ہے۔ڈاکٹر احسن فاروقی نے اس کتاب کے متعلق بیباکانہ خامہ فرسائی کی ہے اور مقدمہ نگاری میں غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کیا ہے۔اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

> ''شمس صاحب کی زیرِ نظر کتاب کی جدید دور میں سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ وہ اس اہم راہ کے نشانات واضح طور پر بتاتی ہے ،جن پر چل کر جدید شعراء اپنا مقصد مستحکم طور پر حاصل کر سکتے ہیں ،ساتھ یہ کتاب صاحبانِ ذوق کے لئے بصیرت افروز ہے اور ذوقِ ادب کے اسی توازن کو برقرار رکھنے کے سلسلہ میں اہم قدم ہے جو حالیؔ اور شبلیؔ نے اپنی کم علمی کی وجہ سے اور جدت کے غلط جوش میں بگاڑ دیا تھا۔''

''لکھنؤ کی شاعری'' کی طرح ''لکھنؤ کی زبان'' اور ''شعور و شاعری'' میں جو مواد پیش کیا گیا ہے، یقیناً بڑی اہمیت کا حامل ہے۔شاعری میں تقابلی رجحان کے فروغ کے حوالہ سے بھی یہ دونوں کتابیں بیحد مفید ہیں۔ان کتابوں کے مطالعہ کی ضرورت اس لئے بھی ہے کہ جدید تنقید نگاروں میں خاصے افراد نے احساس کمتری اور عصبیت کے سبب لکھنوی شاعری کے محاسن

بیان کرنے سے گریز کیا ہے اور معائب تلاش کرنے کی زیادہ سے زیادہ شعوری کوشش کی ہے۔

''نگارشاتِ رنگ رنگ'' مولانا محمد باقر شمسؔ صاحب کے پرمغز اور علمی مقالات و مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ مضامین زیادہ تر زبان و بیان اور لسانیات سے متعلق ہیں ۔مثلاً تخلیقِ زبان کا فلسفہ، زبان کے مرکز کا فلسفہ، متروکات کا مسئلہ ،عطف و اضافت کا مسئلہ وغیرہ ۔ اس کتاب کا مقدمہ مدیر ''طلوعِ افکار'' جناب حسین انجم نے لکھاہے اوراس کی ترتیب وتدوین بھی انھوں نے ہی کی ہے۔ مقدمہ ''تعارف'' کے عنوان سے لکھا گیاہے ۔''تعارف'' میرے نزدیک اس لئے اہم ہے کہ اس میں مولانا موصوف کی شخصیت پر زیادہ سے زیادہ مواد نہایت شائستہ انداز میں پیش کیا گیاہے ۔مولانا کی ہمہ گیر شخصیت اور حسین انجم صاحب کے جاذبِ اثر اسلوب نگارش کے سبب ''تعارف'' کو میں ایک قابلِ ذکر ادب پارہ قرار دیتا ہوں ۔

شکستِ آئینہ، فلسفۂ خیام، درِ منظوم بھی ایسی تخلیقات ہیں ، جن سے حضرتِ شمسؔ کے اجتہادی ذہن اور اعلیٰ علمی وادبی مذاق کا پتہ چلتا ہے۔''انتخابِ دیوان جاوید'' اگرچہ کوئی تخلیقی کام نہیں ہے، لیکن اس کی تالیف کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔اس کتاب پر علامہ نیاز فتحپوری نے لکھا ہے:

''اسلام پر کیا گذری'' مولانا کی ایک ایسی کتاب ہے، جو انھوں نے قرآن واحادیث اور تاریخ کے حوالہ سے لکھی ہے۔ چونکہ مولانا کو اسلامیات ،فلسفہ ،منطق اور مشرقی ادبیات پر دسترس ہے، اس لئے ان کی ہر تخلیق قابلِ ذکر ہے۔

میں نے انتہائی اختصار سے حضرتِ شمسؔ کی شخصیت اور تخلیقات پر تبصرہ کیا ہے، ورنہ ان کے افکار پر باقاعدہ صراحت سے لکھا جائے تو کئی کتابیں لکھی جاسکتی ہیں ۔مولانا کا دم اس دور میں غنیمت ہے ۔خداوندِ تعالیٰ انھیں صحتِ کاملہ عطا فرمائے اور شاداں رکھے! آمین

ماہ خدائے جہاں

ندیؔ الہندی

ماہ توبہ ماہ بخشش ماہِ احساں ہے یہی
ماہِ دیں ماہِ شریعت ماہِ ایماں ہے یہی
ماہِ طاعت ماہِ شفقت ماہِ مہماں ہے یہی
ماہِ قاری ماہِ قرأت ماہِ قرآں ہے یہی
بحر عصیاں میں غریبوں کو سفینہ بن گیا
افضلیت یہ کہ خالق کا مہینہ بن گیا



(بقیہ صفحہ ۳۵ کا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔)

صاحب کے سپرد کیا تھا جو سبحان نگر لکھنؤ کے رہنے والے اور مدرسۂ ایمانیہ کے آخری متعلم تھے مدرسہ ایمانیہ عہد شاہی کا وہ قدیم مدرسہ تھا جو علماء لکھنؤ کی نگرانی میں جاری ہوا تھا۔

نواب صاحب ممدوح نے اس امامباڑے کی کڑیوں دار سقف کو کہنہ ہوجانے سے نئے طرز کی ڈانٹ دے کر بدل دیا امامباڑے کے تبرکات میں کچھ مرقع اور بزرگان دین کی قلمی تصویریں بھی ہیں جن کو موصوف کربلائے معلی بھیجنا چاہتے تھے مگر عمر نے وفا نہ کی اور پیمانہ حیات لبریز ہوگیا۔

اس امامباڑہ میں ہر مہینہ کی ۲۴ کو نواب امیر محل صاحبہ کے بروز انتقال مجلس ہوتی ہے اور ان کے خاندان کے دیگر افراد کی تاریخہائے انتقال میں بھی دیسے ہوتے ہیں اور محلہ کی ماتمی انجمن ماتم حسینی رجب اور بقرعید کی نوچندی کو علم اٹھا کر درگاہ لے جاتی ہے۔

ماخوذ از ماہنامہ الواعظ لکھنؤ رجب ۱۳۶۷ھ/مئی ۱۹۴۸ء ص ۱۲ تا ۱۵/

